مولانا شبیر احمد خاں غوری

صدرِ اسلام میں دینی علوم کے ارتقا کا اجمالی جائزہ

علوم دینیہ کا سرچشمہ قرآن کریم اور وہ ذاتِ مقدس ہے جس پر قرآن نازل ہوا اس لیے ان علوم کا آغاز انہی کے ساتھ ہوا۔

سیرتِ مقدسہ

ایتھنز کے مدرسہ فلسفہ کی قفل بندی (۵۲۹ء) کے چالیس سال بعد فاران کی چوٹیوں سے ہدایت ربانی کا نور آخری مرتبہ چمکا، جس کے برق و لمعان نے عالم کو بقعۂ نور بنا دیا۔ جس سال ابرہہ کی فیل سوار فوج "طیراً ابابیل" کی سجیل باری سے "کعصف ماکول" ہوئی تھی، مکہ معظمہ میں اللہ کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی اور اس طرح دعائے خلیل:

"ربنا وابعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم اٰیاتک ویعلمھم الکتاب والحکمۃ"

"اے رب ہمارے اور بھیج ان میں ایک رسول انہی میں سے کہ ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور انھیں (تیری) کتاب اور حکمت سکھائے"

اور نویدِ مسیحا:

"یا بنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم مصدقاً لما بین یدی من التورٰیۃ و مبشراً برسول یاتی من بعد اسمہٗ احمد"

"اے بنی اسرائیل میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔ اپنے سے پہلی کتاب توریت کی تصدیق کرتا ہوا اور اس رسول کی بشارت سناتا ہوا جو میرے بعد تشریف لائیں گے ان کا نام احمد ہے"

پوری ہوئیں۔

اللہ کا یہ آخری رسول عرب کے شریف ترین گھرانے میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی میں والدین کے سایہ

سے محروم ہو گئے ۔ لہٰذا رسمی تعلیم و تربیت کا کوئی سوال ہی نہ تھا اور یہ اس لیے کہ تورات مقدس کی پیشین گوئی پوری ہو کہ :

"مردِ اُمّی حکیم ہوگا"

بایں ہمہ اُن اخلاقِ فاضلہ سے متصف تھے جو "مثالی" ہیں اور ابرار و اخیار کے اخلاق جن کا پرتو ہیں اس لیے صحیح معنوں میں : "انک لعلیٰ خلق عظیم"

کے مصداق تھے ۔

چالیس سال کی عمر شریف تھی کہ خلعتِ نبوۃ سے مشرف فرمائے گئے ۔ اس رسالت کا مقصد بھی توحید ربوبیت تھا، جس کے لیے انبیائے سابقین مبعوث فرمائے گئے تھے جیسا کہ قرآن کہتا ہے :

"وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحی الیه
انه لا الٰه الا انا فاعبدون" (انبیا - ۲۵)

جن نفوسِ زکیہ کے نصیب میں سعادتِ دارین مقدر ہو چکی تھی، انھوں نے اس دعوت کو بطیبِ خاطر قبول کیا اور مشرف باسلام ہو گئے ۔ مگر اہلِ غرض کا طبقہ جس نے اس حیاتِ عاجلہ ہی کو سب کچھ سمجھ لیا تھا اور جسے نئے دین کے فروغ و اشاعت میں اپنی عیش کوشی و عاقبت فراموشی کی موت نظر آ رہی تھی، اسلام اور پیروانِ اسلام کے مٹانے پر کمربستہ ہو گیا ۔ دنیا جہان کا کوئی ظلم ایسا نہ رہا جو ان غرض کے بندوں نے حق پرستوں کے حق میں اُٹھا نہ رکھا ہو ۔

لہٰذا ۶۲۲ء میں اللہ کے رسول نے اللہ کے حکم سے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ میں ہجرت فرمائی ۔ اب اپنے دین کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو جہاد کا حکم دیا ۔ ۱۷ رمضان ۲ھ کو غزوۂ بدر میں مسلمانوں نے کفارِ قریش کو شکست دی ۔ اگلے سال غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو سخت جانی نقصان اٹھانا پڑا، مگر اس سے انھوں نے ہمت نہیں ہاری ۔ ۵ھ میں قریش دوسرے دشمنِ اسلام قبیلوں اور یہود کے ساتھ مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے مگر اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ دشمنانِ دین خود محاصرہ چھوڑ کر بھاگ گئے ۔

۶ھ میں حدیبیہ کے مقام پر مسلمانوں اور کفارِ قریش کے درمیان صلح ہو گئی ۔ مگر ۸ھ میں قریش نے نقضِ عہد کیا ۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ پر حملہ کیا ۔

لیکن کسی لڑائی کی نوبت نہیں آئی اور مکہ فتح ہوگیا۔ آپ نے کعبہ شریف میں پہنچ کر سارے بُت توڑ ڈالے اور اب اللہ کے گھر میں صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت ہونے لگی۔ اکثریت مسلمان ہوگئی اور عرب میں اسلام کی حکومت قائم ہوگئی۔ اب رومیوں اور ایرانیوں نے اس نئی مملکت کے تباہ کرنے کی تیاریاں کیں۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوج رومیوں کی تادیب کے لیے تبوک کی طرف روانہ کی۔

۱۰ھ میں آپؐ نے حج (حجۃ الوداع) فرمایا۔ اس حج میں آپؐ کے ہمراہ ۱۴۰۰۰ مسلمان تھے۔ اس موقعہ پر آپ نے جو خطبہ فرمایا وہ "خطبۂ حجۃ الوداع" کہلاتا ہے اور اسلام کی تاریخ میں یادگار ہے۔

اب دین کی تکمیل ہو چکی تھی لہٰذا آیت کریمہ:

"الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا"

کا نزول ہوا اور کچھ دن بعد ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو آپ نے سفرِ آخرت فرمایا:

اسلام کوئی سیاسی یا مذہبی تحریک نہ تھی بلکہ ایک کامل دین تھا اور اس حیثیت سے اس نے انسان کی شئونِ حیات کے جملہ پہلوؤں کی اصلاح کی۔ اس میں اس کی ثقافتی ترقی بھی شامل ہے۔ اس لیے اسلام نے علم و حکمت کے حصول پر خاص طور سے زور دیا اور اسے زندگی کی قدرِ اعلیٰ قرار دیا: "ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً"

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طلب علم کو مسلمانوں پر فرض مقرر کیا:

"طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ"

دوسرے موقعہ پر ارشاد فرمایا کہ جہاں بھی مل سکے علم کو حاصل کرو:

"اطلبوا العلم و لو کان بالصین"

حصولِ علم میں پہلا مرحلہ نوشت و خواند میں مہارت کا ہے۔ اسلام نے شروع ہی سے نوشت و خواند کی اہمیت پر زور دیا، یہاں تک کہ وحی الٰہی کا آغاز ہی "اقراء (پڑھ) کے مبارک و مسعود حکم سے ہوا:

"اقرأ و ربک الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان ما لم یعلم"

بعثتِ اسلام کے وقت صرف سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے حکم سے اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت عام ہوگئی اور اسلامی تعلیم کی رُو سے نوشت وخواند معاشرہ کا اہم فریضہ ہوگئے۔ قرآن کہتا ہے :

"یا ایھا الذین اٰمنوا اذا تداینتم بدین الی اجلٍ مسمی فاکتبوہ ولیکتب بینکم کاتب بالعدل" (بقرہ)

لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نوشت وخواند کی اشاعت پر خاص توجہ کی۔ چنانچہ بدر کی لڑائی کے قیدیوں میں جو لوگ اپنا زرِ فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے، آپؐ نے اُن کا فدیہ یہ ٹھہرایا کہ ہر ایسا شخص مدینہ منورہ کے دس بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دے۔

پھر نوشت وخواند کی تقسیم میں اسلام نے شریف و وضیع، آقا و غلام اور مرد و عورت کی کوئی تمیز و تفریق نہیں برتی۔ خواتین میں بھی یہ نعمت عام تھی، چنانچہ اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پڑھ سکتی تھیں لکھتی نہیں تھیں، اور ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا پڑھ بھی سکتی تھیں اور لکھ بھی سکتی تھیں۔

اسلامی ثقافت کی بنیاد اس کا دین ہے۔ لہٰذا اصولی طور پر اس کی ثقافتی سرگرمیوں کا محور علوم دینیہ ہی رہے ہیں۔ پھر دینی علوم کا سرچشمہ قرآن ہے۔ اس لیے عہدِ رسالت ہی سے مسلمانوں نے اس کے ساتھ اعتنا کو سرمایۂ سعادتِ دارین سمجھا۔

قرآن ایک ساتھ نہیں اترا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔ نزولِ وحی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے فوراً قلم بند کرا دیتے تھے۔ صحابہ میں سے جن خوش نصیبوں نے اس مقدس خدمت کو انجام دیا، اُن میں خلفائے اربعہ کے علاوہ اُبی بن کعب اور زید بن ثابت الانصاری زیادہ مشہور ہیں۔

اس زمانہ میں کاغذ نایاب تھا، لہٰذا قرآن سنگین لوحوں، ہڈیوں، پالان کی لکڑیوں اور درختوں کی چھالوں پر لکھا جاتا تھا۔

اس تحریری قلمبندی کے علاوہ اکثر صحابہؓ نے عہدِ رسالت ہی میں قرآن کو حفظ بھی کر لیا تھا۔ ان حفاظِ قرآن میں سے اُبیّ بن کعب، معاذ بن جبل، ابوزید انصاری اور زید بن ثابت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بہت زیادہ مشہور ہیں۔

خلافتِ راشدہ

جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے خلیفہ ہوئے۔ زمامِ خلافت سنبھالتے ہی صدیقِ اکبرؓ کو گوناگون مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سرحد پر رومیوں کے حملے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے مطابق اُن کی تادیب کے لیے اُسامہ بن زید کو روانہ فرمایا اور آخر کار رومیوں کو شکست ہوئی۔ دوسری مشکل مانعینِ زکوٰۃ کی تھی۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اُن کے مطالبہ کو سختی سے دبا دیا، یہاں تک کہ انھیں زکوٰۃ دینا پڑی۔ تیسری مشکل مرتدینِ عرب کی جانب سے تھی۔ اُدھر مدعیانِ نبوت مدینہ منورہ پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ مگر آپ نے اُن کا بھی سختی سے مقابلہ کیا اور انجام کار اُن کا قلع قمع ہوگیا۔

اسی دوران میں معلوم ہوا کہ عرب فتنہ پردازوں کو ایرانیوں کی شہ حاصل تھی۔ لہٰذا اس خطرے کے سدِباب کے لیے فارورڈ پالیسی کے اصول کو اپنایا گیا اور مجاہدین کا ایک لشکر ایران کی طرف بھیجا گیا۔ رومیوں کے خلاف تادیبی کارروائی تو ہو ہی چکی تھی۔ مگر اس کی تکمیل کے لیے مزید فوجی مہمیں روانہ کی گئیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ۱۳ھ میں وفات پائی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُن کے جانشین ہوئے۔ اُن کا عہدِ خلافت اسلامی فتوحات کا عہدِ زرین ہے۔ خالد ابن الولید اور ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہما نے ۱۴ھ ہجری (مطابق ۶۳۵ء) میں دمشق فتح کیا۔ اسی سال سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے قادسیہ کی جنگ میں ایرانی لشکر کو شکست فاش دی۔ اگلے سال ۱۵ھ (مطابق جنوری ۶۳۷ء) میں فلسطین کے اندر یروشلم کے بطریق نے بیت المقدس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے کیا۔ ۱۶ھ میں ساسانیوں (شاہانِ ایران) کا پایۂ تخت مدائن فتح ہوگیا۔ ساتھ ہی عراق بھی عربوں کے قبضہ میں آگیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کے بموجب بصرہ اور کوفہ میں چھاؤنیاں قائم کی گئیں۔ ۱۹-۲۰ھ (مطابق ۶۴۰-۶۴۱ء) میں عمرو بن عاص رضؓ نے مصر کو اسلامی حکومت میں شامل کر لیا۔ ۲۱ھ (مطابق ۶۴۲ء) میں نہاوند کی فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں مسلمانوں کی فتح ہوئی۔ اس طرح ۶۲ھ میں ایران کی فتح مکمل ہوگئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ۲۳ھ میں وفات پائی اور حضرت عثمان ذی النورین خلیفہ

ہوئے ۔ اُن کے زمانہ میں بھی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا ۔ مگر اسلام دشمن طاقتیں اندر ہی اندر خفیہ سازشیں کر رہی تھیں جو یکا یک ۳۵ھ میں منظرِ عام پر آگئیں ۔ اس کے نتیجے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے ۔ اُن کی جگہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلیفہ ہوئے مگر خانہ جنگیاں بڑھتی ہی گئیں ۔ صحابہ کرام کی ایک جماعت قاتلینِ عثمانؓ سے قصاص لینے پر مُصر تھی حضرت علیؓ بھی چاہتے تھے مگر اُن کے ساتھیوں میں سے ایک گروہ مزاحمت کر رہا تھا ۔ فتنہ بڑھتا گیا پہلے جنگ جمل ہوئی ۔ بعد میں امیر معاویہ نے جو شام کے والی اور حضرت عثمانؓ کے رشتہ دار تھے ۔ اُن کے خون کا دعویٰ کیا اور فوجیں لے کر آگے بڑھے ۔ صفین کے مقام پر لڑائی ہوئی ۔ قریب تھا کہ حضرت علیؓ کی فوج کو فتح ہو کہ امیر معاویہ کی طرف سے تحکیم کا شور ہوا ۔ یعنی یہ مسئلہ دو حکموں (پنچوں) کے سپرد کر دیا جائے ۔ حضرت علیؓ اس تجویز کو ماننا نہیں چاہتے تھے مگر فتنہ پردازوں نے جو مشکلات کم کرنے کی بجائے بڑھانا ہی چاہتے تھے ، انھیں اس تجویز کے ماننے پر مجبور کر دیا اور آپ نے مجبور ہو کر عارضی صلح کر لی ۔ کچھ دن بعد فتنہ پردازوں نے کچھ سر پھرے عربوں کو اُکسایا اور انھوں نے حضرت علیؓ سے آکر کہا کہ "تحکیم" مان کر ہم سب نے کفر کیا ۔ آپ بھی اس کفر کا اقرار کیجیے ۔ آپ نے انھیں بہت کچھ سمجھایا ، مگر اُن میں سے ایک جماعت اپنی بات پر اَڑی رہی اور آخر میں حضرت علیؓ سے علیحدہ ہو گئی ۔ یہ لوگ خارجی تھے مجبوراً آپ کو اُن کے خلاف تادیبی کارروائی کرنا پڑی ۔ ادھر حکموں نے غلط فیصلہ دیا اور آپ نے پھر شامیوں کے خلاف تیاری شروع کی ۔ مگر خارجی اپنی فتنہ پردازیوں سے باز نہ آتے تھے اور آخر کار ۴۰ھ میں ایک خارجی عبدالرحمٰن بن ملجم نے آپ کو شہید کر ڈالا ۔ آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے سیّدنا امام حسن رضی اللہ عنہ آپ کے جانشین ہوئے مگر ساتھیوں کی نیت میں فتور دیکھ کر چھ ماہ بعد آپ نے امیر معاویہ سے صلح کر لی اور اُن کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے ۔

عہدِ صدیقی میں مسیلمہ کذاب کے مقابلے میں یمامہ کے مقام پر گھمسان کی لڑائی ہوئی ، جس میں بہت زیادہ مسلمان شہید ہوئے ۔ ان میں ایک کثیر تعداد حفاظِ قرآن کی تھی ۔ اس سے اندیشہ ہونے لگا کہ اگر حفاظ اسی طرح ختم ہوتے گئے تو قرآن کس طرح باقی رہے گا ۔ اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صدیقِ اکبرؓ سے قرآن کریم کو جمع کرنے کی تجویز کی ۔ وہ اس نئے کام کے

لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ مگر آخر حضرت عمرؓ کے پیہم اصرار سے راضی ہو گئے اور یہ اہم کام انھوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کے سپرد کیا جو کاتبِ وحی بھی رہ چکے تھے۔ اُنھوں نے کمال احتیاط و ذمہ داری کے ساتھ قرآن مجید کو جمع کیا۔ اس سے پہلے عربوں میں کوئی کتاب نہ تھی اور مشیتِ ایزدی بھی یہی تھی کہ اس قوم میں پہلی کتاب جو مدون ہو وہ "اللہ کی کتاب" ہو۔

بعد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں جب اختلافِ قرأت بڑھا تو آپ نے "مصحفِ صدیقیؓ" کی نقلیں کرا کر مختلف اقطارِ ملک میں بھیج دیں۔

بعض صحابہ کرام نے احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مجموعے بھی جمع کیے تھے۔ ان میں سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے مجموعے زیادہ مشہور تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں بیت المال قائم ہوا جس سے علم الحساب کو ترقی ہوئی۔ آپ نے "علم الفرائض" Muslim Law of Inheritance کی بھی ہمت افزائی کی۔ چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے:

"اذا لھو تم فالھوا بالرمی واذا تحدثتم فتحدثوا بالفرائض"

حضرت عثمان رضؓ کی شہادت کے بعد بعض صحابہ کرام غیر جانبدار رہو گئے اور انھوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سے بیعت نہیں کی۔ یہ "معتزلہ" کہلاتے اور اس طرح اسلامی تاریخ میں معتزلہ کا لفظ پہلی مرتبہ سننے میں آیا۔ اگرچہ بعد کے اصطلاحی معتزلہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے زمانۂ خلافت میں خارجی فرقہ ظہور میں آیا۔ یہ "تحکیم" کے خلاف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ "لا حکم الا للہ" (اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو "حکم" کا حق حاصل نہیں ہے) یہ لوگ "محکمہ" یا خارجی کہلاتے ہیں۔ خود یہ لوگ اپنے کو "شراۃ" کہتے ہیں۔ (یعنی انھوں نے اپنی جانیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے عوض بیچ دی ہیں) خارجی فرقہ بڑا آتش مزاج تھا۔ وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر کہتا تھا۔ اجل صحابہ کی تکفیر میں بھی اُسے باک نہ تھا۔ اس کے علاوہ حکومت کی خرابیوں کی اصلاح بزورِ شمشیر کرنے کا قائل تھا۔ ان کی شورشیں بعد کے خلفا کے لیے ایک مستقل دردِ سر بنی رہیں۔

دین اسلام کا سارا دارو مدار قرآن کریم پر ہے۔ اس لیے مسلمانوں نے اس کے حفظ و جمع کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح سمجھنے میں بہت زیادہ اہتمام برتا۔ یہ علم "تفسیر" کہلاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فہم قرآن کے بارے میں چار شخصوں کی خصوصیت سے سفارش کی تھی۔ یعنی عبداللہ بن مسعود، اُبی بن کعب، معاذ بن جبل اور سالم مولیٰ حذیفہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ عہدِ صحابہ کے مفسرین میں خلفائے اربعہ کے علاوہ عبداللہ بن مسعود عبداللہ ابن عباس، اُبی بن کعب، زید بن ثابت ابو موسیٰ الاشعری اور عبداللہ بن زبیر خصوصیت سے مشہور ہیں۔ ان میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ "انا مدینۃ العلم وعلی بابھا" کے مصداق تھے۔ دوسرا درجہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا تھا جو "حبر الامۃ" اور "ترجمان القرآن" کہلاتے ہیں۔ اور تیسرا درجہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا ہے۔

دوسرا علم جس کے ساتھ مسلمانوں نے اعتنائے شدید برتا، حدیث تھا۔ دنیا کی کسی قوم نے اپنے ہادی و پیشوا کے اقوال و اعمال کی تلاش و تحقیق اور حفظ و تدوین، نیز اس کی بنیاد پر ایک ہمہ گیر دستورِ حیات مرتب کرنے میں اس درجہ اہتمام نہیں کیا جس قدر مسلمانوں نے کیا ہے۔ اگرچہ شروع میں اس اندیشہ سے کہ کہیں غیر شعوری طور پر قرآن اور حدیث میں التباس نہ ہو جائے، حدیث کی اشاعت پر پابندی لگ گئی تھی۔ مگر جونہی اس التباس کا اندیشہ ختم ہوا مسلمانوں نے غیر معمولی شغف کے ساتھ حدیثِ رسول کے سماع و روایت میں اہتمام کیا۔ عہدِ صحابہ میں یہ علم بہت زیادہ شائع رہا۔ کیونکہ ہر شخص صحابی تھا، جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا، یا آپ کے ارشاداتِ گرامی سنے تھے۔ ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ صحابہ کرام کی تعداد کا احاطہ متعذر ہے۔ ابو زرعہ سے کسی نے کہا کہ احادیث کی تعداد صرف چار ہزار ہے تو انھوں نے فرمایا: یہ دشمنِ اسلام زنادقہ کا قول ہے، ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت ایک لاکھ چودہ ہزار صحابی تھے۔

محدثین صحابہ میں شرفِ اولیت عشرہ مبشرہ یعنی خلفائے اربعہ اور طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف سعد بن ابی وقاص ابو عبیدہ بن الجراح اور سعید بن زید رضی اللہ عنہم کو حاصل ہے لیکن کثرت

روایت حدیث کے لیے چار صحابی مشہور ہیں : ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمر، انس بن مالک اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضوان اللہ علیہم اجمعین - ان کے بعد عبداللہ بن عباس، جابر بن عبداللہ، ابوسعید خدری، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن عاص، امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، ام المومنین ام سلمی رضی اللہ عنہا، ابو موسیٰ الاشعری، براء بن عازب، ابوذر غفاری اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم کا درجہ ہے -

حدیث کے بارے میں صحابہ کا عموماً اپنے حافظہ پر اعتماد تھا، کیونکہ عرب کا حافظہ بے مثل ہوتا تھا لیکن بعض صحابہ نے اپنی مرویات کو قلم بند بھی کر لیا تھا - حدیث کے ان صحائف میں حضرت انس بن مالکؓ، عبداللہ بن عمرؓ، ابو ہریرہؓ، عبداللہ ابن عباسؓ، حضرت علیؓ اور عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مجموعے مشہور ہیں -

قرآن و حدیث کے بعد دینی علوم میں فقہ کا درجہ ہے جو دستورِ حیات کا نام ہے اس لیے علمائے کرام نے اس کے ساتھ بھی غیر معمولی شغف و اہتمام سے کام لیا - عہدِ رسالت میں جن حضرات کو فتویٰ دینے کا حق تھا، وہ تین مہاجر اور تین انصار تھے - مہاجرین میں حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی اور انصار میں ابی بن کعب معاذ بن جبل اور زید بن ثابت رضوان تعالیٰ علیہم اجمعین - ان کے علاوہ مشاہیر فقہائے صحابہ میں خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق، عبداللہ بن مسعود، ابوموسیٰ الاشعری، عمیر بن مالک، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمرو بن عاص اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم قابلِ ذکر ہیں -

لسانی علوم براہِ راست تو دینی علوم کا حصہ نہیں لیکن چونکہ فہم قرآن و حدیث ان علوم میں تبحر و مہارت پر ہی موقوف ہے اس لیے انھیں بھی شروع سے دینی علوم اور دینی مدارس کے نصاب میں ایسی ہی اہمیت حاصل رہی ہے - ان میں دو علم خاص طور سے اہم ہیں : نحو اور لغت -

نحو کی ابتدا ابوالاسود دؤلی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زیرِ ہدایت کی - بعد میں ابوالاسود کے شاگردوں نے اس فن کو ان سے سیکھ کر مزید ترقی دی -

پھر چونکہ قرآن عربوں کی زبان میں نازل ہوا تھا، اس لیے فہم قرآن کے لیے قدیم عربی زبان کا مطالعہ ناگزیر تھا - چنانچہ عہدِ صحابہ میں شعرا کے کلام سے استشہاد کیا جاتا تھا - اور حضرت

عمر رضی اللہ عنہ نے شعرائے عرب کے کلام کا خصوصیت سے مشورہ دیا۔

امیر معاویہؓ اور اُن کی اولاد کا عہدِ حکومت

حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کی شہادت (۴۰ھ) کے بعد اُن کے بڑے صاحبزادے سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے۔ مگر ساتھیوں کی بے وفائی سے مجبور ہو کر چھ مہینہ بعد امیر معاویہ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے۔ اس طرح "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کا زمانہ ختم ہوا اور "ملک عضوض" کا آغاز ہوا۔

نئے خلیفہ کے خاندان میں عرصہ سے وجاہت و ریاست چلی آتی تھی اور حکومتی داؤ پیچ کے بیچ میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ لہٰذا سیاسی تدبر کے اندر وہ قیصر و کسریٰ کے ہم پایہ سمجھے جاتے تھے۔ حافظ جلال الدین سیوطی نے مقبری کا قول نقل کیا ہے:

"تم لوگ ہرقل اور کسریٰ کے سیاسی تدبر سے تعجب کرتے ہو اور امیر معاویہ کو بھول جاتے ہو"

عامۂ اہلِ اسلام اس تبدیلیٔ حکومت سے مطمئن نہ تھے۔ سختی کا کوئی موقعہ نہ تھا، اس لیے انھوں نے ایک جانب حلم و تحمل کو اپنا شعار بنایا (یہاں تک کہ اس باب میں اُن کا نام ضرب المثل بن گیا) اور اپنے مقدور بھر اہلِ بیت نبوت اور اُن کے ہوا خواہوں کے تالیفِ قلب کی کوشش کی۔ دوسری جانب "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کیا اور سب سے زیادہ یہ کہ اسلام کی جمہوری روح کے خلاف سب سے پہلے انھوں نے خاندانی حکومت کی بنیاد ڈالی اور اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد مقرر کیا۔

امیر معاویہ نے ۶۰ھ میں وفات پائی اور اُن کا بیٹا یزید اُن کا جانشین ہوا۔ وہ بجا طور پر "عرب کا نیرو" کہلانے کا مستحق ہے۔ اس کا سب سے بڑا "کارنامہ" سیدنا امام حسینؓ کی شہادت ہے۔ (۶۱ھ) اگلے سال اُس نے اہلِ مدینہ کے خلاف ایک لشکر بھیجا جس نے دیارِ رسول کی بے حرمتی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ تیسرے اور آخری سال مکہ معظمہ عبداللہ بن زبیر کے مقابلے میں ایک لشکر بھیجا جس کی آتش زنی سے غلافِ کعبہ بھی جل گیا۔ آخر حرمین شریفین کی بے حرمتی اور خاندان رسالت پر ظلم ڈھانے کے بعد عرب کے اس "نیرو" نے ۶۳ھ میں انتقال کیا۔

یزید کے بعد اس کا بیٹا معاویہ بن یزید تخت نشین ہوا۔ مگر باپ کے مظالم سے وہ اس درجہ دل برداشتہ تھا کہ چالیس دن بعد ہی انتقال کر گیا۔

امیر معاویہ کے زمانہ میں مذہبی افتراق شروع ہوا جس کی اصل سیاسی تخریب و جماعت بندی تھی۔ ایک جماعت خلافت کو حضرت علیؓ اور اُن کی اولاد میں دیکھنا چاہتی تھی۔ یہ لوگ آگے چل کر شیعہ (شیعانِ علی) کہلائے۔ دوسری جماعت شخصی حکومت کی منکر تھی اور امرا و خلفا کی خلافِ شرع من مانیوں سے بیزار۔ وہ بزورِ شمشیر حکومت میں اصلاح پر مُصر تھی۔ یہ لوگ خارجی تھے جو امویوں کے لیے ایک مستقل خطرہ بنے رہے۔ تیسری جماعت عامہ اہلِ اسلام کی تھی جو تفریق و انتشار بین المسلمین کو ناپسند کرتی تھی اور مسلمانوں میں اجتماع کلمہ کو بہر حال دیکھنا چاہتی تھی۔ یہ "اہل السنت والجماعت" تھے۔

ان میں خارجی فرقہ بڑا آتش مزاج تھا۔ اس نے اپنے سیاسی معتقدات میں تفریط کے علاوہ جو "فلسفیانہ مزاجیت" کے قریب پہنچ گئی تھی، اسلام کے دینی تصور میں بھی افراط سے کام لیا اور گناہ کبیرہ کو کفر کا مترادف قرار دیا۔ یہ لوگ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر کہتے تھے۔ اعتدال پسند طبقہ (اہل السنت والجماعت) گناہ کو بُرا سمجھتا تھا اور گنہ گار کو گنہ گار اور فاسق کہتا تھا۔ بایں ہمہ اسے دائرۂ اسلام سے خارج قرار نہیں دیتا تھا۔ لیکن خوارج کے افراط و تشدد کے مقابلے میں ایک تیسرا فرقہ بھی تھا جس نے خارجیوں کی شدت پسندی کے ردِّ عمل کے نتیجے میں جانب تفریط کو اختیار کیا۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ جس طرح کسی کافر کا نیک عمل اُسے فائدہ نہیں پہنچاتا کسی مسلمان کی بدعملی بھی اس کے ایمان کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ "لا تضر مع الایمان معصیۃ کما لا ینفع مع الکفر طاعۃ"۔ ان لوگوں کا مقولہ تھا۔ یہ لوگ "مرجیہ" کہلاتے تھے۔

اُوپر ان لوگوں کا ذکر آچکا ہے جو حضرت عثمانؓ کی شہادت پر حضرت علیؓ کی بیعت میں شریک نہیں ہوئے۔ نیز ان لوگوں کا بھی جو متحارب بین میں سے کسی کے ساتھ ہو کر نہیں لڑے۔ یہ لوگ "معتزلہ" کہلاتے تھے۔ (تاریخ طبری و تاریخ ابوالفدا) اب نئے "معتزلہ" پیدا ہوئے۔

سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ کے منصبِ خلافت سے دست بردار ہو جانے کے بعد ان کے معتقدین کے لیے سیاسی سرگرمیوں میں کوئی دلچسپی نہیں رہی اور انھوں نے مساجد کے اندر

علم و عبادت کے واسطے گوشہ نشینی اختیار کی۔ اسی گوشہ نشینی و عزلت گزینی (اعتزال) کی وجہ سے وہ "معتزلہ" کہلائے۔ مگر عہدِ مرتضوی کے معتزلہ اور عہدِ معاویہ کے ان معتزلہ کا بعد کے معتزلی فرقے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ملک کے عام سیاسی حالات نے بھی ثقافتی حالات کو متاثر کیا اور مختلف علمی تحریکوں کو پیدا کیا۔

امیر معاویہ عرب کے "دہاۃ اربعہ" (چار مدبروں) میں محسوب ہوتے تھے۔ اُن کے تدبر اور سیاست کاری کی بدولت مختلف علوم کو ترقی ہوئی۔

انھوں نے قبائلی عصبیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے طرفدار قبائل کے شعرا کو نوازا۔ اس طرح شعر و شاعری کا مشغلہ جو بعثتِ اسلام کے بعد سے مُردہ ہو گیا تھا، پھر سے زندہ ہو گیا۔

سیاسی بصیرت کے لیے وہ اپنا بیشتر وقت ملوک گذشتہ کی سیرت سے واقفیت بہم پہنچانے میں صرف کرتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے یمن سے عبید بن شریہ کو بلوا کر تاریخ پر کتابیں لکھوائیں۔ اس طرح اُن کے زمانہ میں تاریخ کے فن کی بنیاد پڑی۔

امیر معاویہ کا ایک اور کارنامہ "استلحاق" ہے۔ ایک شخص زیاد جو ایک لونڈی سمیہ کے بطن سے تھا مگر امیر معاویہ کے باپ کی ناجائز اولاد سے تھا، اُسے حضرت علیؓ سے منحرف کرنے کے لیے اپنا سوتیلا بھائی قرار دے کر اپنے خاندان میں ملا لیا۔ حالانکہ یہ بات شرعاً ناجائز ہے۔ اس سے لوگوں میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں اور لوگ زیاد کی اس ناجائز پیدائش پر طعن و تشنیع کرتے تھے۔ اس لیے اس نے عربوں کے مختلف خاندانوں کے عیوب اور اخلاقی کمزوریوں پر ایک کتاب بعنوان "مثالب العرب" لکھی جس سے آگے چل کر شعوبیوں نے بڑا فائدہ اُٹھایا۔

یزید خلفائے اسلام میں پہلا شخص ہے جس نے ملاہی و ملاعب میں انہماک کیا۔ سرجون رومی جو دیوانِ خراج کا افسرِ اعلیٰ اور عیسائی تھا، اس کے ساتھ بادہ گساری میں شریک ہوا کرتا تھا۔

اس عہد میں تفسیرِ قرآن کے تین اہم مرکز تھے : مکہ معظمہ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ۔ مدینہ منورہ میں حضرت ابی بن کعبؓ اور عراق میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ تفسیرِ قرآن کا درس دیتے تھے۔ موخر الذکر کے تلامذہ میں سے بعد میں علقمہ بن قیس (المتوفی ۶۱ ھ) مسروق (المتوفی ۶۳ھ) اور اسود بن یزید (المتوفی ۷۴ ھ) بھی یہی خدمات انجام دے رہے تھے۔

حدیث کے سلسلے میں اپنے ہادی و پیشوا کے ارشاداتِ گرامی اور انداز زندگی کے ساتھ مسلمانوں کا شغف و اہتمام اپنی آپ ہی مثال ہے اور اگرچہ وقتاً فوقتاً خود شارع نے اس سلسلے میں کچھ پابندیاں عائد کیں، مگر اُن کے شوقِ بے پایاں میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اکثر مشاہیرِ صحابہ نے اس عہد میں بھی حدیث کی روایت کو جاری رکھا۔ جن میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، ابو ہریرہؓ، عبداللہ ابن عمر، عبداللہ ابن عباسؓ، عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ خاص طور پر مشہور ہیں۔ دوسرے طبقہ میں ابو سعید خدری، عقبہ بن عامر، جابر بن عبداللہ، انس بن مالکؓ، علقمہ بن قیسؓ، مسروق بن الاجدعؓ، اسود بن یزید، جبیر بن نفیر الحضرمی، سوید بن غفلہ، ام الدرداء وغیرہم زیادہ مشہور ہیں۔

فقہ کے سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس عہد میں صحابہ کرام قلمروئے خلافت کے بڑے بڑے شہروں میں پھیل گئے تھے۔ ان کی وجہ سے جگہ جگہ مکاتب فقہ قائم ہو گئے۔ مشاہیر فقہائے صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عباس عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عمرو بن عاص خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، یہ چاروں بزرگ جن میں سے ہر ایک کا نام عبداللہ تھا، "العبادلہ الاربعۃ" کہلاتے ہیں۔ عبداللہ بن عباس فقہ کے علاوہ تفسیر میں بھی سرآمد مفسرین روزگار تھے۔ اور عہدِ صحابہ ہی میں "ترجمان القرآن" کہلاتے تھے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دعا دی تھی: اللھم فقھہ فی الدین وعلمہ التاویل۔ عبداللہ بن عمرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے تقریباً ساٹھ سال تک افتا کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ عبداللہ ابن زبیرؓ پہلے مسلمان تھے جو مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد پیدا ہوئے۔ وہ یزید کے مقابلے میں مکہ معظمہ کے اندر خلیفہ ہو گئے تھے، مگر بعد میں حجاج نے جب حملہ کیا تو اس میں شکست کھائی اور شہید ہوئے۔ وہ مناسکِ حج کے سب سے

زیادہ واقف کار تھے۔

ان کے علاوہ اور بھی فقہا تھے، جیسے ابوسعید الخدری، ابوہریرہ، جابر بن عبداللہ الانصاری رافع بن خدیج سیدنا امام حسنؓ، سیدنا امام حسینؓ، زید بن ارقم، نعمان بن بشیر، سمرہ بن جندب الفزاری۔ ان میں سے منصب افتا، عبداللہ بن عباس، عبداللہ ابن عمر، ابوسعید الخدری، ابوہریرہ اور جابر بن عبداللہ الانصاری کو حاصل تھا۔

لسانیات کے سلسلہ میں فن نحو کو حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے ایما سے ابوالاسود الدؤلی نے مدون کرنا شروع کیا تھا۔ مگر اموی عہد میں کچھ ایسے واقعات پیدا ہو گئے کہ اس تدوین کو باقاعدہ طور پر مدون کرنا پڑا۔

زیاد بن ابیہ نے ابوالاسود الدؤلی سے استدعا کی کہ وہ نحو کے فن کو مدون کریں تاکہ لوگوں کو اس کی مدد سے فہم قرآن میں سہولت ہو۔ مگر ابوالاسود اس علم کو جسے انھوں نے حضرت علیؓ سے حاصل کیا تھا، عام کرنا نہیں چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے زیاد سے معذرت کر لی۔ اب زیاد نے ایک شخص کو متعین کیا، جس نے قرآن غلط پڑھا۔ اس سے ابوالاسود کو بڑی تشویش ہوئی۔ وہ زیاد کے پاس پہنچے اور کہا میں نہیں سمجھتا تھا کہ صورت حال اس درجہ بگڑ چکی ہے۔ اب زیاد نے قبیلۂ بنی عبدالقیس کا ایک آدمی انھیں دیا اور وہ اُن کے حسب تلفظ قرآن میں اعراب لگاتا جاتا تھا۔ مگر اس زمانہ میں اعراب کا طریقہ آج کل کے طریقوں سے مختلف تھا،

اس زمانہ میں فتح کے لیے اوپر نقطہ لگاتے تھے۔ کسرہ کے لیے نیچے اور ضمہ کے لیے حرف کے سامنے۔

اس زمانہ میں زندخاں کے کچھ ایرانی بصرہ میں آئے اور قدامہ بن مظعون کے ہاتھ پر ایمان لائے۔ ان میں ایک سعد نام کا بھی تھا۔ ابوالاسود نے اسے دیکھا کہ گھوڑے کو لیے جا رہا ہے اور پوچھا سوار کیوں نہیں ہوتے۔ سعد نے کہا: "ان فرسی ضالع"۔ حاضرین ہنسنے لگے۔ مگر ابوالاسود نے کہا: یہ غیر عرب ہمارے بھائی ہیں۔ رغبتِ اسلام کی غرض سے عربی بولنا چاہتے ہیں مگر صحیح نہیں بول سکتے۔ اس لیے ہمیں ان کی مدد کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ اس کے بعد انھوں نے "فاعل و مفعول" کا باب مرتب کیا۔ یہ مبحث ابوالاسود کے شاگرد یحییٰ بن یعمر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ابن الندیم

(المتوفی ۳۷۸ھ) کے زمانہ تک موجود تھا اور اُس نے اسے دیکھا تھا۔

ابوالاسود دؤلی کے شاگردوں میں یحییٰ بن یعمر کے علاوہ عنبسہ بن معدان (عنبسۃ الفیل)، میمون بن اقرن، اور نصر بن عاصم کو خاص طور سے شہرت نصیب ہوئی۔

مروانیوں کا عروج

یزید بن معاویہ کے آخر عہدِ حکومت میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ مکہ معظمہ میں عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ یزید نے اُن کے مقابلے میں ایک لشکر جرار بھیجا۔ مگر اس کی کامیابی سے پہلے ہی یزید کے دن پورے ہو گئے۔ اُس کے بعد اس کا بیٹا معاویہ بن یزید خلیفہ ہوا، مگر چالیس دن بعد وہ بھی راہیٔ ملکِ عدم ہوا۔ اب خود لشکرِ یزید کا رجحان اجتماع کلمۂ امت کی خاطر عبداللہ بن زبیر کی جانب تھا، مگر مروانیوں نے جو امویوں کے چچیرے بھائی ہوتے تھے، اسی خاندان میں خلافت قائم رکھنے کے لیے مروان بن الحکم کو خلیفہ بنا لیا۔ اُدھر سیدنا امام حسینؓ کے انتقام کی آگ عام مسلمانوں کے سینہ میں آتش زن تھی، ان کے اس جذبہ سے فائدہ اٹھا کر ایک شخص مختار ثقفی نے اُن کے انتقام کے نام پر اموی حکام کے خلاف خروج کیا اور قاتلینِ حسین کو چُن چُن کر اُن کے کیفرِ کردار کو پہنچایا۔ اس کے بعد اس کا تصادم عبداللہ بن زبیر کی افواج سے ہوا اور اسے شکست ہوئی۔ اس طرح عبداللہ بن زبیر کی قوت بٹ گئی۔ اتنے میں مروان مر گیا اور اس کا بیٹا عبدالملک اُس کا جانشین ہوا۔ اس کے سپہ سالار حجاج نے عبداللہ بن زبیر کو شکست دے کر انھیں قتل کر ڈالا۔ اس طرح عبدالملک کچھ سے پورے عالمِ اسلامی کا خلیفہ ہو گیا۔ (۷۳ھ)

عبدالملک نے ۸۶ھ میں وفات پائی اور اس کا بیٹا ولید خلیفہ ہوا۔ اس نے بھی حجاج کو عراق کی گورنری پر برقرار رکھا۔ ولید کا زمانہ عظیم الشان فتوحات کے لیے مشہور ہے: مغرب میں طارق نے اندلس (اسپین) کو فتح کیا اور مشرق میں محمد بن قاسم نے ۹۳ھ میں سندھ کو اور ۹۵ھ میں ملتان کو فتح کیا اور اس طرح برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔

ولید نے ۹۶ھ میں وفات پائی اور اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک خلیفہ ہوا۔ وہ بڑا عادل اور نیک منش خلیفہ تھا۔ اسی نیک منشی کا نتیجہ ہے کہ اُس نے اپنے بعد اپنے بیٹے کو ولی عہد نہیں بنایا بلکہ اپنے چچازاد بھائی عمر بن عبدالعزیز کے لیے وصیت کی۔

سلیمان کی وفات ۹۹ھ پر حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے۔ وہ حضرت عمر فاروق رضؓ کے نواسے تھے۔ اس لیے خلیفہ ہو کر انھوں نے بھی حضرت عمرؓ کی طرح عدل و انصاف کو اپنا شعار بنایا۔ مگر وہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہے اور ۱۰۱ھ میں وفات پا گئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد امویوں کا زوال شروع ہوا۔ یوں بھی پہلی صدی ختم ہو رہی تھی اور لوگ انقلاب کی توقع کر رہے تھے۔

خارجیوں کی شورشیں اس زمانہ میں بھی جاری رہیں اور اُن کے مختلف فرقے ظہور میں آتے رہے۔ ان کے مقابلے میں فرقہ مرجئہ کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ عقیدۂ ارجا کے سب سے سرگرم علمبردار اس زمانہ میں محمد بن حنفیہ (جو حضرت علیؓ کے صاحبزادے اور حضرات حسنینؓ کے سوتیلے بھائی تھے) کے صاحبزادے ابوہاشم تھے۔

عہدِ صحابہ کے آخر میں عبداللہ بن زبیر یا عبدالملک کے عہدِ خلافت میں "قدریت" اسلامی فکر میں داخل ہوئی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ بدعت یہود سے آئی۔ بعض کے نزدیک مجوسیوں سے آئی اور ایک قول یہ ہے کہ امویوں کے مظالم کے نتیجہ میں خود مسلمانوں ہی میں پیدا ہوئی۔ بہرحال صحابہ کرام اس بدعت سے بیزار تھے۔ البتہ بعض اکابر تابعین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کا اس جانب رجحان تھا۔ ان میں حضرت حسن بصریؒ کا نام خاص طور سے مشہور ہے۔

عہدِ ماقبل کی طرح سیاسی حالات نے بھی ثقافتی حالات کو متاثر کیا جس کے نتیجے میں مختلف علمی تحریکیں ظہور میں آئیں:

معاویہ بن یزید کے بعد جب امویوں کا اقتدار کمزور پڑنے لگا تو خاندان والوں نے مروان بن الحکم کو جو خاندان میں سب سے زیادہ عمر رسیدہ تھا۔ اس شرط پر خلیفہ بنایا کہ اُس کے بعد پہلے اُس کا بیٹا عبدالملک خلیفہ ہوگا اور پھر یزید کا بیٹا خالد۔ مگر عبدالملک نے خلیفہ ہو کر خالد بن یزید کو ولی عہدی سے معزول کر دیا۔ مجبور ہو کر روپیہ کی ہوس میں خالد بن یزید نے کیمیا اور مہوسی کی طرف توجہ کی اور یونانی و قبطی زبانوں سے کیمیا، نیز طب و نجوم کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ اور اس طرح اس تحریک کا سنگِ بنیاد رکھا گیا جو آگے چل کر منصور عباسی اور پھر مامون الرشید کے زمانہ میں اپنے عروج کو پہنچی۔ خالد بن یزید کا مترجم خاص اصطفن تھا۔

سیاسی مفاد کی بدولت امیر معاویہ کے زمانہ سے مغربی دیوان خراج پر نصرانی اور مشرقی پر مجوسی چھائے ہوئے تھے۔ یہ لوگ خود کو حکومتی نظام کی روح رواں سمجھتے تھے اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ عبدالملک نے اُن کا زور توڑنے کے لیے دیوانِ خراج کو عربی میں منتقل کرادیا۔ اس سے عربی زبان کی اہمیت بڑھ گئی اور آیندہ کے لیے ترجمہ کے واسطے فضا ہموار ہوگئی۔

عبدالملک کے بیٹے ولید کو تعمیرات سے بڑی دلچسپی تھی۔ اکثر عمارات اس کی بنوائی ہوئی ہیں۔ ان میں دمشق کی جامع مسجد خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ تعمیرات کے علاوہ اس نے رفاہ عام کے بہت سے کام کیے: شفاخانے بنوائے۔ یتیموں کے لیے مکاتب کھلوائے، نادار اپاہجوں اور مزمن امراض کے مریضوں کے لیے مکانات بنوائے۔ علما و فقہا کے لیے وظائف مقرر کیے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز عدل و انصاف میں عمر فاروقؓ کے ثانی تھے۔ اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہ جاتے تو خارجیوں اور قدریوں کی بدعتیں ختم ہو جاتیں۔ کیونکہ ان دونوں بدعتوں کی اصل وجہ امویوں کا ظلم و ستم تھا۔ اُن سے پہلے برسرِ منبر حضرت علیؓ کو برا بھلا کہا جاتا تھا۔ مگر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسے موقوف کرکے خطبہ میں "ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھی عن الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون" کا اضافہ کیا۔

جہاں تک علمی سرگرمی کا تعلق ہے انھوں نے محدثین کو روایتِ حدیث کے لیے ترغیب دی نیز محض نفع رسانی خلق کے لیے اہرن القس کی "طبی کناش" کا عربی میں ترجمہ کرایا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز ہی کے عہدِ خلافت میں اسکندریہ کا مدرسۂ فلسفہ جو تقریباً ایک ہزار سال سے چلا آرہا تھا، انطاکیہ میں منتقل ہوا۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ تفسیر قرآن کے اہم مرکز تین تھے: مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور عراق۔ مکہ معظمہ میں حضرت عبداللہ بن عباس کے شاگرد یہ خدمت انجام دے رہے تھے۔ ان میں سعید بن جبیر (المتوفی ۹۵ھ) مجاہد بن جبیر (المتوفی ۱۰۴ھ) عکرمہ (المتوفی ۱۰۴ھ) عطاء بن ابی رباح (المتوفی ۱۱۴ھ) طاؤس بن کیسان (المتوفی ۱۰۶ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

مدینہ منورہ میں حضرت اُبی بن کعب کے تلامذہ تفسیر کا درس دیتے تھے - ان میں ابوالعالیہ (المتوفی ۹۰ھ) محمد بن کعب القرظی (المتوفی ۱۱۸ھ) زید بن اسلم (المتوفی ۱۳۶ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

عراق میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے شاگرد یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ ان میں اسود بن یزید (المتوفی ۷۴ھ) مرۃ الہمدانی (المتوفی ۷۶ھ) عامر بن شرجیل (المتوفی ۱۰۹) اور الحسن البصری (المتوفی ۱۱۰ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

حدیث کے ساتھ امتِ مسلمہ کے بے پناہ شغف و اہتمام کا ذکر اوپر ہو چکا ہے جو آج کے دن تک باقی ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عہدِ خلافت میں مدینہ منورہ کے والی کو تدوین حدیث کے لیے تاکید کی تھی، اور جیسا کہ امام بخاری نے "صحیح" میں فرمایا ہے لکھا تھا: "جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو تلاش کرو اور انھیں قلمبند کراؤ۔ کیونکہ مجھے علم کی بوسیدگی اور علما کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث قبول کرو۔ علم کی علانیہ اشاعت کرو، تاکہ نہ جاننے والے بھی جان جائیں۔ علم جبھی ضائع ہوتا ہے جبکہ چند مخصوص لوگوں کی ملکیت بن جائے"۔ اس ترغیب و تشجیع کا نتیجہ ظاہر ہے۔ چنانچہ عہد کے مشاہیر محدثین میں امام زین العابدین، ابراہیم النخعی، سعید بن مسیب، سعید بن الجبیر، حسن البصری، عروہ بن الزبیر، ابو رجاء العطاردی، ابوالعالیہ، جابر بن زید، عبداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود، شعبی، سالم بن عبداللہ بن عمر، طاؤس بن کیسان، عطاء بن یسار، سلیمان بن یسار، مجاہد بن جبیر، عطاء بن ابی رباح خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

ادھر صحابہ کرام نے مختلف شہروں میں جا کر فقہ کے مکاتب قائم کر دیے تھے، چنانچہ اس عہد میں مدینہ منورہ کے اندر جو جو فقہا ہوئے ان میں سعید بن المسیب (المتوفی ۹۴ھ) عروہ بن الزبیر (المتوفی ۹۷ھ) محمد بن الحنفیہ (المتوفی ۷۲ھ) علی بن الحسین زین العابدین (المتوفی ۹۴ھ) حسن بن محمد بن الحنفیہ (المتوفی ۱۰۰ھ) قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق (المتوفی ۱۰۲ھ) ابوبکر بن عبدالرحمٰن (المتوفی ۹۴ھ) عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود (المتوفی ۹۹ھ) سالم بن عبداللہ بن عمر (المتوفی ۱۰۶ھ) خارجہ بن زید بن ثابت (المتوفی ۱۰۰ھ) سلیمان بن یسار (المتوفی ۱۰۷ھ) ابوسلمہ

ابن عبدالرحمٰن الزہری (المتوفی ۱۰۴ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

ان کے علاوہ مدینہ منورہ میں دو فقیہ ایسے بھی تھے جو بعد میں منصب خلافت پر فائز ہوئے: ایک عبدالملک بن مروان اور دوسرے حضرت عمر بن عبدالعزیز۔ فقہائے مکہ میں عطا بن رباح، مجاہد بن جبیر، عبداللہ بن ابی ملیکہ اور عکرمہ مولی ابن عباس زیادہ مشہور تھے۔ فقہائے بصرہ میں حسن البصری، جابر بن یزید الازدی (المتوفی ۹۳ھ) محمد بن سیرین (المتوفی ۱۱۰ھ) ابو العالیہ مسلم بن لیسار ابو قلابہ (المتوفی ۱۰۶ھ) اور فقہائے کوفہ میں ابو مسلم عبیدہ بن عمر السلمانی (المتوفی ۷۲ھ) شریح بن الحارث القاضی (المتوفی ۸۲ھ) الحارث الاعور، عامر بن شراحیل الشعبی، سعید بن جبیر اور ابراہیم بن یزید زیادہ مشہور تھے۔ ان کے علاوہ یمن میں طاؤس بن کیسان، وہب بن منبہ، عطا بن مرہود۔ شراحیل بن شرجیل الصنعانی، شام میں ابو ادریس الخولانی، مکحول، ابن حوشب الاشعری اور مصر میں ابو عبداللہ عبدالرحمٰن بن عسیلہ الصنابحی، ابو تمیم عبداللہ بن مالک بن الجشانی وغیرہم تھے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ نحو کی بنیاد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایما سے ابو الاسود الدئلی نے ڈالی تھی۔ بعد میں انھوں نے زیاد بن ابیہ کے زمانہ میں اسے منظم طور پر مدوّن کیا، اُن کے بعد اُن کے شاگردوں نے اس علم کو ترقی دی۔ ان میں نصر بن عاصم کو خاص طور سے شہرت حاصل ہوئی۔ حتیٰ کہ بعض لوگ تو انھیں نحو کا واضع سمجھتے ہیں۔ نصر بن عاصم کے شاگرد خصوصی ابو عمر بن العلا تھے۔ نصر بن عاصم نے حجاج بن یوسف کی ولایت عراق کے زمانہ میں حروف متشابہ پر نقطے لگا کر عربی حروف کی کتابت کو مکمل کر دیا۔

مروانیوں کا زوال

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ "خلافت علی منہاج النبوۃ" کا ادارہ ختم ہو گیا۔ اُن کے بعد یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوا۔ (۱۰۱ھ)۔ وہ چالیس دن تو اپنے پیشرو کے نقش قدم پر چلا۔ مگر پھر مروانی تجبر کی طرف منحرف ہو گیا۔ اُس کے زمانہ میں یزید بن المہلب نے خروج کیا۔ خلیفہ نے اس کی تادیب کے لیے اپنے بھائی مسلمہ بن عبدالملک کو بھیجا۔ یزید بن مہلب کو شکست ہوئی اور عقیر کے مقام پر جو کربلا کے قریب ہے قتل کیا گیا۔ مورخ کلبی نے اپنے بچپن کی سنی ہوئی بات نقل کی ہے:

"ضحّی بنو اُمیّہ یوم کربلاء بالدین ویوم العقیر بالکرم"

"بنو امیّہ نے دین اور شرافت دونوں کو ذبح کر دیا : دین کو کربلا میں اور شرافت کو میدانِ عقیر میں"۔

یزید بن عبدالملک نے ۱۰۵ھ میں وفات پائی اور اس کا جانشین اس کا بھائی ہشام بن عبدالملک ہوا جس نے ۱۲۵ھ تک حکومت کی۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ اموی خلفا میں تین مدبرین گذرے ہیں۔ تیسرا مدبر ہشام تھا۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا ولید بن یزید خلیفہ ہوا۔ وہ بڑا فاسق و بدکار تھا جسے توہینِ شریعت میں بھی باک نہ تھا۔ آخر اس کے فسق و فجور سے ناراض ہو کر لوگوں نے بغاوت کی اور سال بھر بعد اُسے محصور کر کے قتل کر ڈالا۔

ولید بن یزید کے بعد اس کا چچا زاد بھائی یزید بن ولید خلیفہ ہوا۔ وہ قدیم بادشاہوں کا نواسہ ہوتا تھا، کیونکہ اُس کی ماں ساسانی تاجدار یزدجرد کی پوتی اور اس کی نانی خاقانِ ترکستان اور قیصر روم کی اولاد میں سے تھی۔ اسے خود اپنی عالی نسبی پر ناز تھا۔ چنانچہ کہا کرتا تھا:

انا ابن کسریٰ و ابی مروان   وقیصر جدی وجدی خاقان

(میں کسریٰ کا بیٹا (نواسہ) ہوں اور میرا باپ (دادا) مروان ہے اور قیصر میرا نانا ہے اور دوسرا نانا خاقان ہے)

چونکہ اُس نے خلیفہ ہو کر فوج کی تنخواہ کم کر دی تھی، اس لیے وہ یزید الناقص کہلاتا تھا، ویسے وہ بڑا دیندار تھا اور معتزلہ کے مسلک طرف رجحان رکھتا تھا۔ اسی لیے خلیفہ ہو کر اُس نے غیلان دمشقی کے پیروؤں کو جو فرقہ قدریہ کا سرگروہ تھا، تقرب بخشا۔ یہی وجہ ہے کہ معتزلہ یزید بن ولید کو حضرت عمر بن عبدالعزیز پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔

مگر یزید چھ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہا اور اس کے کچھ دن بعد مروان الحمار خلیفہ ہوا۔ وہ بڑا جفاکش اور محنتی تھا (اسی وجہ سے "حمار" کہلاتا ہے) دوسرا لقب "جعدی" تھا کیونکہ وہ جعد بن درہم کا شاگرد تھا جو مسلمانوں میں مسلک "تعطیل" کا بانی ہے۔ حافظ ابنِ تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ اسی "تعطیل" کی نحوست اس کے ساتھ اموی خلافت کو بھی لے ڈوبی۔ اس کا زمانہ شورشوں کے فرو کرنے کی کوشش میں گذرا۔ مگر اب اموی اقتدار کے دن ختم ہو چکے تھے۔ خراسان میں عباسیوں کے طرف داروں نے خروج کیا۔ اُن کی سربراہی ابو مسلم خراسانی کر رہا تھا۔ مروان کو شکست پر شکست ہوئی اور وہ مصر کی طرف بھاگنا چاہتا تھا کہ بوصیر کے مقام پر پکڑا گیا اور قتل ہوا۔ اس طرح اموی

خلافت ختم ہوئی اور عباسی خلافت کا آغاز ہوا۔

ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں سیدنا زید بن علی نے خروج کیا، مگر ناکام ہو کر شہید ہوئے اُن کے پیرو "شیعہ زیدیہ" کہلاتے ہیں۔ وہ خلافت کا مستحق تو آلِ علیؓ ہی کو سمجھتے ہیں، مگر دوسرے شیعہ فرقوں کی طرح "شیخین" (حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما) کو بُرا نہیں کہتے۔ جن لوگوں نے اُن کا ساتھ دیا، اُن میں امام ابوحنیفہؒ بھی تھے۔ اسی لیے ہشام نے انھیں کوڑوں سے پٹوایا تھا۔

اسی زمانہ میں اکابر تابعین میں سے حسن بصریؒ کا حلقہ بصرہ میں قائم تھا۔ صوفیاءِ کرام کے سلسلے عموماً انھیں کے واسطے سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچتے ہیں۔ ان تلامذہ میں دو شخص واصل بن عطا الغزال اور عمرو بن عبید مشہور ہیں۔ اس زمانہ میں "مرتکب کبیرہ" کا مسئلہ بڑے زوروں سے چل رہا تھا۔ خارجی لوگ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر کہتے تھے۔ اُن کے مقابلہ میں فرقۂ مرجئہ تھا، جس کے سرگرم علمبردار اس زمانہ میں محمد بن حنفیہ کے صاحبزادے ابوہاشم تھے۔ مرجئہ کا کہنا تھا کہ جس طرح کافر کا نیک عمل اُسے فائدہ نہیں پہنچاتا، اسی طرح گناہ ایمان کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن ایک شخص حسن بصریؒ کے پاس آیا اور "مرتکب کبیرہ" کا حکم دریافت کیا۔ وہ ابھی جواب بھی نہ دینے پائے تھے کہ واصل بول اُٹھا کہ وہ نہ کافر ہے، نہ مسلمان، بلکہ دونوں کے "بین بین" ہے۔ اس عقیدہ کو جو "المنزلۃ بین المنزلتین" کہلاتا ہے۔ احداث کرنے کی بنا پر وہ دونوں حسن بصریؒ کے حلقۂ تلمذ سے نکالے گئے یا کنارہ کش ہو گئے۔ ("اعتزالا") اسی لیے محض مؤرخین کے قول کی بنا پر وہ اور اُن کے متبعین "معتزلہ" کہلاتے ہیں۔ لیکن غالباً معتزلہ کا فرقہ اس سے پہلے سے موجود تھا کیونکہ ابوالفرج اصفہانی نے "الاغانی" میں لکھا ہے کہ بصرہ میں چھ آزاد خیالوں بشار بن برد، صالح بن عبدالقدوس، عبدالکریم بن ابی العوجا، واصل بن عطا، عمرو بن عبید اور ایک ازدی شخص (جس کے مکان پر ان لوگوں کی نشست ہوا کرتی تھی) کی انجمن تھی۔ آخر میں ازدی میزبان توسمنی (بدھ مذہب کا پیرو) ہو گیا اور باقی لوگوں نے دوسرے مسالک اختیار کیے۔ ان میں سے واصل بن عطا اور عمرو بن عبید کے متعلق لکھا ہے: "فصارا الی الاعتزال"۔ (وہ دونوں اعتزال یا معتزلہ کے مذہب کی طرف مائل ہو گئے) اس سے معلوم ہوتا

ہے کہ مذہب اعتزال واصل اور عمرو بن عبید سے کہیں پہلے سے تھا۔

جو کچھ بھی ہو اس زمانہ میں معتزلہ کا بہت زیادہ اثر تھا، کیونکہ انھیں معتزلہ کی مدد سے یزید بن ولید اپنے پیشرو ولید بن یزید کو تخت سے اتار کر خود خلیفہ ہوا تھا۔ بہرحال اصطلاحی "معتزلہ" کا آغاز واصل بن عطا اور عمرو بن عبید نے کیا۔

اس زمانہ میں بھی "قدریت" (انسان کے فاعل مختار ہونے کا عقیدہ) آزاد خیال حلقے میں بہت زیادہ شائع رہا۔ حتیٰ کہ اکابر تابعین میں سے بعض جلیل القدر تابعی جیسے حسن بصریؒ، مکحول، قتادہ بن دعامہ وغیرہم اس عقیدے کی جانب مائل تھے۔ کھلے ہوئے قدریوں میں غیلان دمشقی، واصل بن عطاء، عمرو بن عبید تھے۔ "قدر" کے ردِ عمل کے طور پر "جبر" کا عقیدہ پیدا ہوا جس کا بانی جہم بن صفوان تھا۔

دوسری صدی کی ابتدا میں کلام باری کا مسئلہ پیدا ہوا اور اس کے ساتھ "تعطیل" کی بدعت (یعنی اللہ تعالیٰ کسی صفت سے متصف نہیں ہے) اسلامی فکر میں در آئی۔ یہ دراصل یہودیوں کا انداز فکر تھا۔ اُن میں سے تفلسف زدہ طبقہ توریت کے کلام باری ہونے کا منکر تھا۔ بعثت اسلام کے وقت لبید بن اعصم یہودی جس نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دیا تھا، اس عقیدے کا قائل تھا۔ لبید سے اس کے بھانجے طالوت نے اور طالوت سے بنان بن سمعان نے اس عقیدے کو اخذ کیا۔ بنان بن سمعان سے جعد بن درہم نے یہ عقیدہ لیا۔ اس سے بڑی بے چینی پھیلی۔ اور ہشام نے عراق کے گورنر خالد بن عبداللہ القسری کو جعد بن درہم کے قتل کا حکم دیا۔ خالد نے عید اضحیٰ کے دن خطبہ کے بعد اسے خود اپنے ہاتھ سے ذبح کیا۔

جعد سے یہ بدعت جہم بن صفوان نے لی (جو عقیدہ "جبر" کا بھی بانی ہے) وہ بھی صفات باری تعالیٰ کا منکر تھا اور اسی کے نام پر صفات باری کے انکار کا عقیدہ "تجہم" یا "جہمیت" کہلاتا ہے۔ جہم ۱۲۸ھ کی خانہ جنگیوں میں خراسان کے اندر قتل ہوا۔

بہرحال اس صفاتِ باری کے انکار (تعطیل) بالخصوص قرآن کے مخلوق ہونے کے عقیدہ نے بڑی خطرناک شکل اختیار کر لی اور علمائے محدثین نے بڑی سختی سے اس کی مذمت کی۔ پھر بھی یہ ترقی کرتا رہا۔ اور اسی "مسئلہ کلام باری" کی وجہ سے اسلام کو عقلیت کی روشنی میں پیش کرنے کی

کوشش کا نام "کلام" اور اس کے علمبرداروں کا نام "متکلمین" قرار پایا۔

اہلِ السنت والجماعت کے حلقوں میں یہ عہد امام ابو حنیفہؒ کی تدوینِ فقہ کے لیے مشہور ہے وہ پہلے علمِ کلام کے عالم متبحر تھے، مگر بعد میں فقہ کی طرف متوجہ ہوئے اور حماد بن ابی سلیمانؒ کی جو اس زمانہ میں فقہائے کوفہ کے شیخ تھے، شاگردی اختیار کی۔ حمادؒ کی وفات پر امام ابو حنیفہؒ ہی اُن کے جانشین بنے اور اُس فقہی نظام کی بنا ڈالی جو "حنفی فقہ" کہلاتا ہے اور جو اس وقت دنیا کا عموماً اور برصغیر کے مسلمانوں کا خصوصاً مذہب ہے۔

دوسری زبانوں سے عربی میں ترجمہ کی تحریک جسے پچھلی صدی میں خالد بن یزید نے جاری کیا تھا اس صدی میں بھی جاری رہی۔ مگر خالد بن یزید یا حضرت عمر بن عبدالعزیز کی طرح خلفا اور امرا نے ان مترجمین کی سرپرستی نہیں کی۔ اموی خلفا کے اکثر کتاب (دیوان کتابت یا سکرٹریٹ کے عہدہ دار) محض تفنن طبع کے طور پر یونانی اور فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا کرتے تھے۔ ان میں جبلہ بن سالم کا نام خاص طور سے مشہور ہے۔ ۱۱۳ھ میں بعہد ہشام بن عبدالملک ایران کے اندر ساسانیوں کی ایک لائبریری ملی جس کی کتابیں بوسیدہ ہو چکی تھیں۔

کہتے ہیں کہ امویوں ہی کے عہد میں خراسان کے اندر کاغذ کا کارخانہ قائم ہوا ورنہ اس سے پہلے ایران میں کھالوں پر لکھا جاتا تھا۔

امویوں کے عہدِ زوال میں نجوم اور جوتش کو بھی بڑا فروغ ہوا۔ مگر اس کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس لیے ذیل میں صرف دینی علوم کی ترقی کا اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

سابق عہد کے مفسرین میں سے بعض اربابِ کمال اس عہد تک زندہ رہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کے تلامذہ میں سے عطا بن ابی رباح (المتوفی ۱۱۴ھ) حضرت اُبیّ بن کعبؓ کے تلامذہ میں سے محمد بن کعب القرظی (المتوفی ۱۱۸ھ) اور زید بن اسلم (المتوفی ۱۳۶ھ) اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے تلامذہ میں سے عامر بن شراحیل (المتوفی ۱۰۹ھ) اور سیدنا امام حسن بصریؒ (المتوفی ۱۱۰ھ) کی سرگرمیاں اس عہد میں بھی جاری رہیں۔

ان کے علاوہ اس عہد کے مشاہیر مفسرین میں سے عمرو بن دینار، قتادہ بن دعامہ، سیدنا امام محمد بن باقر، ابو اسحاق سبیعی، ابو الزناد اور ہشام بن عروہ رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین خصوصیت سے

قابلِ ذکر ہیں۔

سابق عہد میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی دلچسپی سے حدیث کے ساتھ اعتنا کو خصوصی ترقی حاصل ہوئی۔ اس عہد میں بھی یہ ترقی جاری رہی چنانچہ اس عہد کے مشاہیر محدثین میں سے ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں امام حسن بصری (المتوفی ۱۱۰ھ) محمد بن سیرین (المتوفی ۱۱۰ھ) میمون بن مہران (المتوفی ۱۱۷ھ) نافع (المتوفی ۱۱۷ھ) وہب بن منبہ (المتوفی ۱۱۴ھ) مکحول (المتوفی ۱۱۳ھ) زہری (المتوفی ۱۲۴ھ) عمرو بن دینار (المتوفی ۱۲۶ھ) ابوسعید مقبری (المتوفی ۱۲۵ھ) قتادہ بن دعامہ (المتوفی ۱۱۸ھ) امام محمد باقر (المتوفی ۱۱۴ھ) محمد بن المنکدر (المتوفی ۱۳۰ھ) یحییٰ بن ابی کثیر (المتوفی ۱۲۹ھ) ایوب السختیانی (المتوفی ۱۳۱ھ) زید بن اسلم (المتوفی ۱۳۹ھ) سلمہ بن دینار (المتوفی ۱۴۰ھ) ابوالزناد (المتوفی ۱۳۱ھ) منصور بن زاذان (المتوفی ۱۳۱ھ) ہشام بن عروہ بن زبیر (المتوفی ۱۴۶ھ) یونس بن عبید (المتوفی ۱۳۹ھ) موسیٰ بن عقبہ (المتوفی ۱۴۱ھ) خالد الحذاء (المتوفی ۱۴۲ھ) سلیمان بن التیمی (المتوفی ۱۴۳ھ) حمید الطویل (المتوفی ۱۴۲ھ) ابواسحاق الشیبانی (المتوفی ۱۳۸ھ) الاعمش (المتوفی ۱۴۸ھ) ابومسعود الجریری (المتوفی ۱۴۴ھ) اور ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن (المتوفی ۱۳۶ھ) کا تذکرہ کیا ہے۔

فقہ کے اندر مختلف شہروں میں فقہاء کرام نے جو مختلف فقہی مکاتب قائم کیے تھے وہ ان کے تلامذہ کی مساعی جمیلہ سے اس عہد میں بھی ترقی کرتے رہے جیسے مکہ معظمہ میں عبداللہ بن ابی ملیکہ (المتوفی ۱۱۹ھ) عکرمہ مولی ابن عباس (المتوفی ۱۱۵ھ) عطا ابن ابی رباح (المتوفی ۱۱۵ھ) عمرو بن دینار (المتوفی ۱۲۶ھ) اور عبداللہ بن ابی نجیح (المتوفی ۱۳۲ھ) مدینہ منورہ میں ابن شہاب الزہری (المتوفی ۱۲۴ھ) امام باقر (المتوفی ۱۱۴ھ) عبدالرحمٰن بن القاسم بن محمد بن ابی بکر (المتوفی ۱۲۶ھ) ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن (المتوفی ۱۳۶ھ) جو ربیعۃ الرائے کے نام سے مشہور ہیں) اور ابوالزناد (المتوفی ۱۳۰ھ) یمن میں طاؤس بن کیسان (المتوفی ۱۰۶ھ) اور وہب بن منبہ (المتوفی ۱۱۴ھ) شام میں مکحول (المتوفی ۱۱۸ھ) سلیمان بن موسیٰ الاشرق (المتوفی ۱۱۹ھ) یحییٰ بن یحییٰ الغسانی (المتوفی ۱۳۵ھ) اور میمون بن مہران (المتوفی ۱۱۷ھ) کوفہ میں حکم بن عیینہ (المتوفی ۱۱۵ھ) حبیب بن ابی ثابت (المتوفی ۱۱۷ھ) اور حماد بن ابی سلیمان (المتوفی ۱۱۹ھ) اور بصرہ میں حسن بصری (المتوفی ۱۱۰ھ) محمد بن سیرین (المتوفی ۱۱۰ھ) ابوالعالیہ

المتوفی ۱۰۶ھ) قتادہ بن دعامہ (المتوفی ۱۱۷ھ) ایوب السختیانی (المتوفی ۱۳۱ھ) یونس بن عبید۔ (المتوفی ۱۳۹ھ)

ان ناموں کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ علماء کرام بیک وقت تفسیر، حدیث اور فقہ میں دست گاہِ عالی رکھتے تھے۔

ابھی ائمہ اربعہ کا زمانہ نہیں آیا تھا، البتہ اس کی ابتدا ہو گئی تھی، کیونکہ مروجہ مذاہب فقہیہ کے اماموں میں سب سے مقدم امام ابوحنیفہؒ تھے۔ زیرِ نظر عہد کا ثلث آخر اُن کے علمی تبحر اور فقہی شہرت کا زمانہ ہے۔

امام ابوحنیفہؒ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ وقت کے عام دستور کے مطابق تعلیم حاصل کی۔ اکثر صحابہ کرام کی بھی زیارت کی اور ان میں سے بعض سے احادیثِ رسول بھی سماع فرمائیں اس لیے وہ تابعین (متاخرین) میں محسوب ہوتے ہیں۔ شروع میں علم کلام کے اندر وہ دست گاہ عالی حاصل کی کہ اس فن میں سرآمد فضلائے روزگار قرار پائے، چنانچہ امام شافعی کا قول ہے: "الناس عیال علی ابی حنیفہ فی الکلام"

لیکن بعد میں فقہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اس علم کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا۔ ہوا یہ کہ کوفہ کی مسجد کے اندر مختلف علمائے عالی مرتبت کے حلقے قائم ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک حلقہ درس امام ابوحنیفہ کا تھا جس میں بکثرت طالبانِ علم شریک ہوتے تھے۔ ایک دن ایک بدوی عورت کوئی شرعی مسئلہ پوچھنے آئی۔ امام صاحب کے حلقۂ تلامذہ کی کثرت سے متاثر ہو کر سیدھی امام صاحب کے پاس پہنچی اور جا کر وہ مسئلہ دریافت کیا۔ امام صاحب نے کہا مجھے نہیں معلوم، مگر وہ صاحب (امام حماد بن ابی سلیمان) جو سامنے بیٹھے ہیں، اُن سے پوچھ لو۔ عورت بدویہ نے بڑی ترش روئی سے کہا کیسے عالم ہو، اتنی بڑی تعداد شاگردوں کی لیے بیٹھے ہو مگر ایک عورت کو مسئلہ نہیں بتا سکتے۔ بدوی عورت کے اس چبھتے ہوئے طعنہ نے امام صاحب کی زندگی کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ حلقۂ درس کو برخاست کر دیا اور اُٹھ کر امام حماد بن ابی سلیمان کے پاس پہنچے اور ان سے جا کر فقہ پڑھنے کی درخواست کی۔ پہلے تو انھیں یقین نہ آیا۔ مگر جب امام صاحب کو سچ دیکھا تو پھر انھیں اپنا شاگرد کر لیا اور فرمایا، روزانہ صرف پانچ مسئلہ

حاصل کیا کرو۔ ظاہر ہے امام صاحب جیسا عبقری روزگار جس کے ذہن میں مدت العمر کے علم کلام کی ممارست نے غیر معمولی حدت اور درّاکی پیدا کر دی تھی، جب ایک دن میں صرف پانچ مسئلہ سیکھتا ہوگا تو اُن میں کس درجہ بصیرت و حذاقت بہم پہنچاتا ہوگا۔ اس بصیرت و حذاقت نے اُن کے فقہی نظام کو یہ دبدبائی اور قبولِ عام بخشے کہ آج بھی وہ سوادِ اعظم کا معمول بہ ہے۔

امام صاحب نے بے شمار شیوخ سے علم حاصل کیا اور بے شمار شاگردوں نے ان سے کسبِ فیض کیا جن میں سے دو بزرگ خصوصیت سے مشہور ہیں: امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ (جو دونوں "صاحبین" کہلاتے ہیں) مگر اُن کی مساعی علمیہ اور اس طرح امام ابو حنیفہؒ کے بعد کی فقہی سرگرمیاں عباسی عہد کے پہلے دَور کے تحت میں آتی ہیں جو ہمارے موضوع سے باہر ہے۔

اسلام اور چند معاشی مسائل

سید یعقوب شاہ

اس کتاب کے مصنف مالیات کے بھی ماہر ہیں اور دینی علوم سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ اپنی اس تصنیف میں انھوں نے ربوٰ، زکوٰۃ اور بیمہ جیسے زندہ اور اہم معاشی مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اور کتاب و سنت، تاریخ، عمرانیات اور اقتصادیات کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد اپنے نتائجِ فکر شستہ اور سلیس انداز میں قلمبند کیے ہیں۔

قیمت عام ایڈیشن: ۵ روپے — عمدہ ایڈیشن: ۶٫۵۰ روپے

پتہ

سکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور